يا خدا

قدرت الله شهاب

قدرت اللہ شہابؔ

یا خُدا

لاہور اکیڈمی

۲۰۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 027812
MAILSI

طبع اوّل : ۱۹۴۸ء
طبع ششم : ۱۹۶۸ء

ناشر : سردار محمود چودھری
طابع : استقلال پریس، لاہور
قیمت : [redacted] روپے

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ترتیب

اس کہانی کی کہانی

جو قدرت اللہ شہاب نے خاص اس ایڈیشن کے لیے لکھی ہے

ربُّ المشرقین

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور،

ربُّ المغربین

مری دنیا میں تیری پادشاہی،

ربُّ العالمین

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

مہاجرین کے نام

جو ابھی بقیدِ حیات ہیں

لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے

اِس کہانی کی کہانی

ستمبر ۱۹۴۷ کا مہینہ تھا اور ہندوستان سے لُٹ پٹ کر آنے والے مجروح قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا جو پہلے آ گئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں واگہ بارڈر پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا، واگہ پار کی بے کراں پہنائی میں گم تھا۔ اکثر کا یہ انتظار موہوم ثابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پیاروں کے جانگزا انجام کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ و خراب عزیزوں کو پا لیتے تھے لیکن کم۔ مایوس و نامراد منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھنے کی ہوتی تھی۔

میں بھی انتظار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چچازاد بھائی نعمت اللہ شہاب کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نعمت اللہ میرا چچازاد بھائی

ہی نہ تھا، لنگوٹیا دوست بھی تھا جس کے ساتھ چمکور کے سکول میں میں نے کیا کیا دھومیں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیہاتی سکول میں انگریزی کا ماسٹر تھا اور اپنی سبک نین نقشے والی بیوی کے ہمراہ کہیں بچھڑ کے رہ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا کشتوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کیمپ میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بہرحال مجھے اس کا انتظار تھا۔ یہ آس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک روز آیا، لیکن میں اسے نہ پہچانا۔ لوگوں کو متجسس دیکھتا ہوا میں اس کے پاس سے دو تین بار گزر گیا، آخر اس نے خود مجھے 'قدرت' کہہ کے آواز دی۔

یہ نعمت اللہ کوئی اور تھا۔ اس ہنس مکھ البیلے جوان کی جگہ ایک صدیوں کا ماندہ ہڈیوں کا ڈھانچ لباس خون آلود، چہرہ غبار آلود — میں نے پوچھا "نعمت! بھابی کہاں ہے؟" وہ رو دیا اور اپنے پاس بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کا چہرہ داغ داغ تھا۔ صبیح چہرے کی کھال جیسے جلتی ہوئی آہنی سلاخوں سے داغ دی گئی ہو۔ ہوا بھی یہی تھا، اس ہمت اور غیرت والی خاتون نے اپنا چہرہ خود داغا تھا تاکہ کیمپ میں آنے والے شکاریوں کی نظر ہوس سے محفوظ رہے۔ وہ چہرہ نہ داغتی تو اس وقت داگ کے اس پار نہ ہوتی اور اب تک غالباً اس کا سارا جسم دغ چکا ہوتا — نعمت اللہ کا یہ عالم اس طرح ہوا کہ چند سورماؤں نے کیمپ کے کنوئیں میں نیلا تھوتھا گھول دیا تھا۔ بعضے اس آبحیات کو پی کر کیمپوں میں زندہ

جاوید ہو گئے، نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آنتیں اس مشروب سے کٹ کر رہ گئیں ـــــ نعمت اللہ اسی روز ـــــ اس ارض موعود میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد بار حیات اتار کر سُبکسار ہو گیا۔ وہ عفیفہ' اس کی بیوی تیسرے روز چل بسی اور میں جو اتنے دنوں سے منتظر تھا۔ خالی ہاتھ کراچی واپس آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا رات بھر اس کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر میں بیٹھا یہ کہانی لکھتا رہا۔ نعمت اللہ کی کہانی ـــ اپنے گاؤں چمکور کی کہانی۔ اپنے گاؤں کے ملا علی بخش کی بیٹی دلشاد کی کہانی۔ کیمپوں کا حال جو میں نے لکھا ہے، لاہور میں دیکھا۔ مہاجر بہنوں کا شکار کرنے والے بہت سے بھائی جن کے چہرے یا خدا میں نظر آئیں گے۔ مولوی' خدام خلق' قوم کے لیڈر اور سیاست داں، سبھی اصلی کردار ہیں۔ میں نے ان کے نام نہیں لکھے۔ ان میں ایک صاحب کو تو خدا نے وزیر مملکت بھی بنایا۔ خدا جسے چاہے جو عزت دے دے۔ اس کی مصلحتیں وہی جانے۔

اس کہانی کا انجام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری گنہگار آنکھوں نے کراچی کے عید گاہ میدان میں دیکھا جہاں بے خانماؤں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہیں دلشاد' یا اس نام کی عورتیں مجھے پکوڑے تلتی' بیچتی نظر آئیں۔ ساتھ والی سے کہا۔ "بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا' میں بیس سے آؤں"۔ اور کسی کے ساتھ بیس لینے چل دیں۔ یہ پکوڑے برسوں تلے جاتے رہے اور بکتے رہے، شاید اب بھی ان

میں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے ہونہار قلی، مزدور یا بھک منگے اس ارضِ موعود کے شہریوں میں شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء ابھی ختم نہیں ہوا۔

اس کہانی کی کہانی بھی ختم نہیں ہوئی۔

کراچی کے بعد میرا تقرر لاہور میں محکمہ صنعت کے ڈائرکٹر کے طور پر ہوا۔ ایک روز ڈاک میں ایک پھٹا پرانا پیلا لفافہ مجھے ملا۔ سواد تحریر قطعی طور پر اجنبی تھا۔ میں نے کھولا، یہ ایک لڑکی کی داستان تھی جو یکہ و تنہا بے یار و مددگار اچھرہ کے قریب مہاجرین کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم داغا گیا لیکن میں اس پار پہنچ گئی۔ یہ دھرتی میرے لیے فردوس کی سرزمین اور یہاں کا ہر مسلمان مجھے شفیق بھائی دکھائی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہوسناک شکاری نکلے۔ انھوں نے میری جو خاطر و مدارات کی ہے، اس کے طفیل اب میں تپ دق کی مریض ہوں اور میرے بہت دن باقی نہیں تھوڑا پڑھی لکھی ہوں۔ "یا خدا" کہیں سے مل گئی تھی میں نے پڑھی مجھے یہ کہنا ہے کہ میں دلشاد بن کر بھی دلشاد نہ بن سکی۔ میں ان مجبوروں میں سے ہوں جو ہنسی خوشی پکڑے نہیں تل سکتیں۔ بین نہیں لا سکتیں اور اس پاک سرزمین میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میرے پاس ایک لمبی سی شورلیٹ کار تھی۔ اُن دنوں اس کی قیمت سستی اور

شان زیادہ تھی ..... اسے میں نے ان جھونپڑیوں سے دُور سڑک پر چھوڑا، اور پوچھتا پچھاتا ڈھونڈتا ایک ٹاٹ کی جھگی میں پہنچا۔ وہاں ایک ویران آنکھوں والی، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی۔ لڑکی کیا تھی راکھ کا ڈھیر یا چوبِ خشک صحرا ـــــ لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا۔

راستے میں کوئی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک بار اس لڑکی نے لمبی آہ بھری، اور کہا شہاب صاحب۔ میں اس سے زیادہ لمبی اور چمکیلی کاروں میں سوار ہو چکی ہوں جن دنوں یہاں کیمپ میں تھی اور انھی کاروں میں واپس کیمپ پہنچ جاتی تھی۔

اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی مل گیا اور تھوڑا بہت روزی کا وسیلہ بھی ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر کراچی میں ایک نوکری پر چلا گیا۔

ایک روز میرے چپڑاسی نے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون بھی ہیں۔ نام ان صاحب کا میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے انھیں اندر بلایا اور کہا معاف کیجئے میں آپ کو پہچانا نہیں۔ ان صاحب نے مسکرا کر اس برقعہ پوش خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے اب نقاب اُلٹ دیا تھا۔ یہ ایک چمپئی رنگ کی شعلہ رخسار خاتون تھی۔ اس نے کہا، میں اچھرہ کی جھگی میں رہنے والی دلشاد ہوں جو دلشاد نہ بن سکی، یہ میرے میاں ہیں۔ اور

میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کیونکہ میں پھر زندوں میں ہوں۔

رات کو یہ لوگ میرے ہاں کھانے پر آئے۔ دوسرے روز پھر دس کروڑ آبادی میں گم ہو گئے اور اس پر کئی سال گزر گئے۔

پچھلے دنوں ـــــ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں صدر پاکستان کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کے دورے کی ایک منزل دہران میں اُترا۔ یہ تیل کا مرکز ہے اور امریکہ کا ایک اہم فوجی اڈہ، یہاں حسبِ رسم ہمارا تعارف مقامی عہدہ داروں اور معززین سے کرایا گیا۔ انھی میں ایک صاحب پاکستانی تھے، ریشمی صافہ باندھے ہوئے، انھوں نے کہا شہاب صاحب آپ مجھے پہچانے ؟ میں نادم ہوا تو بولے میں آپ سے کراچی میں ملا تھا اور یہ میری بیوی ہیں۔ انھیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ وہی خاتون تھیں لیکن اب پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر جوانی کے علاوہ خوشحالی کی آسودگی اور طمانیت کا نور تھا اس نے بتایا کہ اب ہمارا تین سال کا ایک بچہ بھی ہے۔

اس کتاب کے لکھے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یقین ہو گیا کہ موت کے بعد تو نہیں البتہ اس ارضی زندگی میں آواگون کا چکر ضرور چلتا ہے۔ زندہ انسان آخری موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتا اور کئی بار نیا جنم لیتا ہے۔

کشتگان خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جب میں دلشاد کی زندگی کو مخالفانہ تنقیدوں کے پشارے کے ساتھ تولتا ہوں جو اس کتاب

پر چھپیں تو مجھے یہی زندگی بھاری نظر آتی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے چھپنے پر مجھ سے ناخوش ہوئے اور مجھے بہت سے طعن سننے پڑے لیکن اس روشن بشاش اور صبیح چہرے کے مقابلے میں جو مجھے دہران میں نظر آیا! ان کی کیا حقیقت ہے۔ اگرچہ اس نتیجے کو بھی میں ضمنی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے یار جانی نعمت اللہ اور اس کی سبک چہرہ بیوی کی کہانی لکھنی تھی جن کے انتظار میں میں ہفتوں داگہ کے بارڈر پر کھڑا رہا۔ اور جن کی تلاش میں میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا قلم پوری طرح لکھنے سے قاصر رہا۔

قدرت اللہ شہاب

یکم ستمبر ۱۹۶۱ء

ربُّ المشرقین

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور

"اُس طرف کیا تکتی ہے، سالی؟ تیرا کوئی خصم ہے اُدھر؟"——

امریک سنگھ نے کرپان کی نوک سے دلشاد کی پسلیوں کو گدگدایا، اور بایاں گال کھینچ کر اُس کا منہ پچھم سے پورب کی طرف گھما دیا۔

دلشاد مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اس کا خاصہ بن گئی تھی۔ بچپن میں اس کا کامیاب ترین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک ذرا سی رین رین، راں راں کر کے وہ ماں کے سینے میں چھپاتے ہوتے دودھ سے لے کر الماری میں رکھی ہوئی برفی تک ہر چیز کو حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہٹ میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اس کی

ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سورج یا تارے بھی اُسے اٹھالے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔

رحیم خاں جھوٹا تھا۔ مکار کہیں کا۔ آسمانوں کی بات تو دُور کی بات تھی وہ تو اسے زمین ہی پر کھو بیٹھا۔ دلشاد نظر بچا بچا کر قبلہ رُو ہو بیٹھتی تھی اور خیال ہی خیال میں اپنی جبیں کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس کے دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کراں دنیا پوشیدہ بتائی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعبہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تصوّر دلشاد کے دل میں عقیدت اور امید کا ایک تابناک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ لیکن امریک سنگھ کو پچھم سے بے حد چڑ تھی۔ یوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چند رواج بڑے ٹیڑھے تھے، ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے تک اُن کے اعصاب کمان کی طرح تنے رہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بستی بھر کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو بجلی کے تار میں پرو کر برقا دیا ہے۔

امریک سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن

میں ایک بھیانک سا واہمہ پرورش پا رہا تھا۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ سرِ شام ہی مسجد کے کنوئیں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں ——— جیسے دو چار بکریوں کو بیک وقت ذبح کیا جا رہا ہو۔

"سالا حرامی" امریک سنگھ کہا کرتا تھا "مرنے کے بعد بھی ڈکرا رہا ہے، بھینسے کی طرح۔ ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنوئیں میں"

"ارے چھوڑ دو بھی" امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مذاق اڑاتا تھا "بانگ دے رہا ہے مُلّا بانگ"

"خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پوری پوری آزادی ہے —— ہاں" گیانی دربار سنگھ جبڑے بھاڑ کر ہنستا۔

لیکن امریک سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سناٹے میں جب مسجد کا کنواں گلا پھاڑ کر چنگھاڑتا، تو اس کا تن بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مُلّا علی بخش کی تصویر آ جاتی، جو مسجد کے حجرے میں رہا کرتا تھا، نحیف بدن، دو ہاتھ کی لمبی داڑھی، آنکھوں پر موٹے گلاس کا چشمہ، سر پہ سبز ململ کی بے ڈھب سی پگڑی، ہاتھوں میں رعشہ،

گردن میں ابھری ہوئی رگیں۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کے پانچ وقت اذان دیتا تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بخش کے نحیف و نڈھال گلے سے وہ زناٹے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آبشاریں دست بداماں ہو کر گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریک سنگھ کی بیوی کو بڑی کوفت ہوتی تھی، ایک وقت یا دو وقت کی بات ہوتی تو خیر، لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اُسے یہی بول سُننا پڑتے تو وہ گھبرا جاتی۔ اس نے بڑے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ اذان میں کالے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جوان عورتیں اُسے سُن کر "بانگی" جاتی ہیں۔ اگر بن بیاہی نوخیز لڑکی بانگی جائے تو اُس کے بانجھ ہونے کا ڈر تھا۔ اگر بیاہی ہوئی بیوی بانگی جائے تو اس کے حمل گرنے لگتے تھے! چنانچہ امریک سنگھ کے گھر میں پشتہا پشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی آواز فضا میں لہرائی اُدھر کسی نے کٹورے کو چمچے سے بجانا شروع کیا۔ کسی نے چمٹے کو توے سے لڑایا۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ گئی، کوئی بھاگ کر پچھلی کوٹھڑی میں جا گھسی ——— اور اس طرح بہادر خاندان اپنی لاڈلیوں کی کوکھ کو کالے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا

رکھتا آیا تھا۔

امریک سنگھ کی بیوی کے بطن میں سوا لاکھ خالصے پرورش پا رہے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سوا لاکھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدھی رات گئے جب مسجد کا کنواں امریک سنگھ کی بیوی کے تصوّر میں بھیانک اور ہولناک گوبخ بن کر ڈکارتا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی یہ بہادر فوج ہڑبونگ مچانے لگتی۔ کبھی اس کے کانوں میں کنویں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں۔ کبھی اس کے تصوّر میں کنویں کا دہانہ جبڑے پھاڑ کر اس کی طرف لپکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سا لگا رہتا کہ ملا علی بخش کنویں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے اور چشم زدن میں کنویں کی منڈیر پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے "بانگ" کے رکھ دے گا۔

امریک سنگھ کی بہن کے بطن میں تو ابھی کسی خالصے نے اپنا گھر نہیں جمایا تھا۔ کیونکہ ابھی وہ بن بیاہی تھی لیکن اس کے دل پر سوا لاکھ کا قبضہ تھا رات کو جب وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر ان میٹھی میٹھی گدگدیوں کو یاد کرتی جو مکئی کے کھیتوں کی اوٹ میں سوا لاکھوں کی بھوکی انگلیاں اُس کے

تن بدن کو چھلنی بنا کے رکھ دیتی تھیں تو اس کے سینے میں ارمانوں کا ایک ہجوم سا اُمڈ آتا اور وہ تصوّر ہی تصوّر میں اپنے جسم کو جوان جوان، قوی قوی خالصوں کے وجود سے آباد کر لیتی ——— لیکن پھر مسجد والے کنویں کی دلدوز چنگھاڑ اس کے ایوانِ تصوّر کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معاً اُسے محسوس ہوتا کہ کنویں کی عمیق گہرائی سے بھی ملّا علی بخش کالے جادو کے بول پکار پکار کر اس کے پیٹ سے چلنے والی نسلوں کے ناکے بند کر رہا ہے۔

امریک سنگھ کو اپنی بیوی اور بہن دونوں پر غصّہ آتا تھا۔ بزدل کی بچیاں مُلّا علی بخش تو کب سے دُور دفان ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ امریک سنگھ نے خود اُسے نیزے کی نوک پر اچھالا، تروک سنگھ نے اُس کو اپنی تلوار پر آزمایا، گیانی دربار سنگھ نے اُس کے جھنجھناتے ہوئے خون آلود جسم کو تڑاخ سے کنویں میں پھینک ڈالا۔

ایک ملّا علی بخش ہی پر کیا منحصر تھا۔ اب تو چکور کا سارا گاؤں صاف ہو چکا تھا۔ بانگیں دینے اور سننے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ گئے تھے، کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردن پر خالصوں کی مقدس کرپانیں سجدہ ریز ہو چکی تھیں ——— لیکن یہ ڈرپوک حرام زادیاں تھیں کہ اب بھی وہی بانگوں

کے ڈر سے اپنے بچہ دانوں کو چھپاتے چھپائے پھرتی تھیں۔ چنانچہ جب امریک سنگھ کی بیوی اور بہن سوتے سوتے چیخ کر چھاتیاں پیٹنے لگتیں تو اس کا دل طیش سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چمٹا اٹھا کر انھیں مار مار کر لہولہان کر دیتا۔ مارتے مارتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے، بازوؤں میں تھکن آجاتی، رگیں پھول جاتیں اور وہ اپنی گنجان داڑھی سے پسینے کے قطروں کو جھاڑتا ہوا دیوانوں کی طرح لپک کر دلشاد کے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دائمی زکام کا مریض دماغ کی ریزش کو ہلکا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نسوار سونگھ لیا کرتا ہے، اسی طرح گاؤں بھر کے خالصے اپنی وہم آلود بیویوں اور بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشارِ خون دھیما کرنے کے لیے دلشاد کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔

دلشاد کو مسجد میں رکھا گیا تھا کیونکہ حجرے کی چھت جل جلا کر گر چکی تھی۔ یوں تو اُس کے سرمائے میں جسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اُس کا عزیز ترین سرمایہ اس کے ابّا کی تسبیح تھی۔ ملّا علی بخش کے ہاتھ اسی تسبیح پر گھومتے گھومتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول گول دانوں پر اس کی انگلیوں کے نشان نقشِ فریادی کی طرح پیوستہ تھے۔ سالہا سال کے گریۂ

نیم شبی اور فغانِ سحری کے آنسو اس تسبیح میں موتیوں کی طرح پروئے ہوتے تھے۔ یہی چند موتی تھے جن کے وجود سے دلشاد کا لٹا ہوا صدف ابھی تک آباد تھا ——— وہ دن بھر اس تسبیح کو گلے میں ڈال کر قمیض کے نیچے چھپائے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی ویران کونے میں دبا دیتی تھی، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھنگ اور شراب میں سموئی ہوئی زبانیں اس کے ابّا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی چاٹ چاٹ کر ناپاک نہ کر دیں'

آدھی آدھی رات گئے وہ مسجد والے کنویں کی منڈیر پر رویا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنویں میں ٹکٹکی لگائے پک جاتی تھیں کہ شاید کبھی اس کے ابّا کی تیرتی ہوئی پگڑی کی ایک جھلک اُسے دکھائی دے' اس کے کان کنویں کی طرف لگے لگے تھک جاتے تھے کہ شاید کبھی اس کے ابّا کی آخری سسکی اُسے ایک بار پھر سنائی دے یا وہ خوفناک چنگھاڑیں جنھوں نے گاؤں بھر کی عورتوں کو پریشان کر رکھا تھا، شاید اس کے منتظر کانوں کو بھی نوازیں ——— لیکن کنواں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمگادڑ اس میں پَر پھڑپھڑاتی' تو ——— ہر پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ بدبُو اور تعفن کے تیز تیز بھبکے فضا میں منتشر ہو جاتے

تھے۔ کیونکہ سوا لاکھ بہادروں نے ملّا علی بخش کا گلا مرنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے کنویں کو غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے اٹا اٹ بھر دیا تھا۔

دلشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹکڑے آسمان کے ویرانوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط لُٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے یار و مددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی، سہمی ہوئی، گھبرائی ہوئی، حیران ۔۔۔۔ لیکن اس کے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خالصے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چچوڑ چچوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے، تو گویا انھیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔

چملکور کی مسجد گوردواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہوئی اور بن بیاہی ماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ ملّا علی بخش کے بعد ملّا علی بخش کی بیٹی ان کی کوکھ لوٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ تو چمٹے کھا کھا کر اپنی چارپائیوں سے لگ کر سو جاتی تھیں لیکن ان کے بہادر خالصے رات

رات بھر دلشاد کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا کیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ، امریک سنگھ کا باپ۔ امریک سنگھ کا بھائی ——

ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ، دوسرے خالصے کے بعد تیسرا خالصہ

—— رات بھر وہ نظریں بچا بچا کر، موقعہ جانچ جانچ کر

مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ بھنی ہوئی کلیجی اور گردے اُڑتے۔

تلے ہوئے کبابوں کا دَور چلتا۔ شراب اور بھنگ کی بالٹیاں بٹتیں اور اپنی

نسل بندی کے وہ بیج جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں سَو سَو طرح

کے جتن کرتی تھیں، وہ بلا دریغ مسجد کی چار دیواری میں بکھیر آتے ——

—— اور ایک دن بیٹھے بٹھائے یکایک دلشاد سرسوں کی طرح پھول اٹھی۔

جب یہ خبر پھیلی تو گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ چیخ کر اپنا سر

پیٹ لیا۔ کنواری لڑکیوں نے رو رو کر آنکھیں سُجا لیں اور مکئی کے کھیتوں

میں چھپ چھپ کر اپنے خالصوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ کنویں کی چنگھاڑیں تیز تر

ہونے لگیں۔ گھروں میں فِٹ پر فِٹ آنے لگے۔ چمٹے پر چمٹے چلنے لگے،

ایک کہرام سا مچ گیا۔

پہلے تو سب کی یہ رائے ہوئی کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی دلشاد

کو مار کے کنویں میں پھینک دیا جائے۔ لیکن پھر امریک سنگھ کو ایک مفید تجویز سوجھی۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کے تھانہ میں لے گیا اور اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی برآمدگی کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لیے دلشاد کو پیش کر دیا۔

تھانیدار بھورام نے امریک سنگھ کی کارگزاریوں کو خوب سراہا — پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی کمشنر بہادر سے بھی سند دلوانے کا وعدہ فرمایا ——— پھر تھانیدار صاحب نے عینک اٹھا کر دلشاد کا جائزہ لیا۔ قبول صورت' جوان' ذرا پیلی سی لیکن .گرم گرم، گداز ——— لیکن جب ان کی نظر دلشاد کے پیٹ پر پڑی۔ تو ان کی ابھری ہوئی امیدوں کو ایک زبردست دھکا لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو، تو وہ اسے ابھی تھانہ ہی میں رکھ لیں۔ لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ نے جوڑ توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاص" ہونے میں تین ساڑھے تین مہینے باقی ہیں تو تھانیدار بھورام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا

کر جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جانگیہ پہن کر چارپائی پر لیٹے تو انھوں نے دلشاد کو پاؤں دبانے کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ تھانیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آگیا پھر گھٹنوں میں۔ پھر رانوں کے اندر، پھر کولہوں کے آس پاس ——

—— اور وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دُکھتی ہوئی رگوں کا درد دبواتے رہے۔ تھانیدار بھورام کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسکین تھا۔ جہاں ہوا تو کیا، جہیں ہوا تو کیا؟

دلشاد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس نے زندگی کے پیچ کچھ اس طرح کھولے تھے کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی گویا مرہم کا پھاہا بن کر رہ گئی تھی۔ جو کوئی اسے جہاں سے جی چاہتا لگا لیتا اور اس کے جسم کا ہر حصہ بھڑکتے ہوئے، ہانپتے ہوئے، بے چین انسانوں کو چند ہی لمحوں میں تسکین کا جام پلا دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی رگ رگ میں کتنے پھوڑے تھے، کتنی ٹیسیں تھیں، کتنے رستے ہوئے زخم تھے، کاش! رحیم خاں ہوتا تو دیکھتا۔

دلشاد کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بیچارے رحیم خاں

کو اتنی بار ناحق مایوس کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اُسے زبردستی چومنے کی کوشش کی تھی تو دلشاد نے غصّہ سے اس کے سر پر ایسا دوہتڑ مارا تھا کہ اُس کی چوڑیاں ٹوٹ کر رحیم خاں کے ماتھے میں گڑ گئی تھیں، اور وہ خود ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسُولؐ رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بچارا رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تھانیدار بھورام کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد ذرا کم ہوا تو انھوں نے دلشاد کو چھٹی دی اور ہیڈ کانسٹبل دریودھن سنگھ کے ساتھ اُسے انبالہ کیمپ بھیج دیا گیا۔ راستہ میں ہیڈ کانسٹبل دریودھن سنگھ کے کولہوں اور گھٹنوں میں بھی کئی بار درد اٹھا۔ لیکن دلشاد بڑی تندہی سے اس کے درد کا مداوا کرتی گئی اور دس گھنٹے کی مسافت انھوں نے دس بارہ دِنوں میں بخیر و عافیت طے کر لی۔

انبالہ کیمپ میں بہت سی لڑکیاں تھیں، بہت سی عورتیں۔ جوان بھی، خوبصورت بھی۔ لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح، کہ جن کے شرر بجھ گئے ہوں، جن کی کہکشاں لٹ گئی ہو، جن کی تنویروں پر کیچڑ مل دیا گیا ہو۔

ہر روز فوج کے ٹرک آتے تھے اور نئی نئی لڑکیوں، نئی نئی عورتوں کو

انبالہ کیمپ میں چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی تسبیح کے یہ بکھرے ہوئے انمول موتی پھر اپنے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی اُن پر اپنے "سبحان" اپنے "غفور الرحیم" اپنے "پاک پروردگار" اپنے "قادر مطلق" کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ کمانڈر میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانمرد سپاہی ابھی تک ان پر گرد کی بانی چلتے تھے۔ خیر دلشاد کو اب ایک قسم کی چھٹی تھی۔ یوں تو نیک اولاد ہمیشہ اپنے ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے لیکن دلشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسا تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجبور ماں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

انبالہ کیمپ کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔ سورج کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں چاندی کے تار بن کر چمکتی تھیں اور دُور، بہت دور مغرب کی طرف ان کی نقرئی لڑیاں خوابوں کے سہانے جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں۔ ان جزیروں کے کہیں آس پاس دوزخ کی سرحد جنت کی سرحد سے ملتی تھی اور کیمپ کی عورتیں ریل کی پٹڑیوں کو چھُو چھُو کر سرشار ہو جاتی تھیں کہ ان کا دوسرا سرا مشرقی پنجاب میں نہیں مغربی پنجاب میں ہے! مغربی پنجاب!!

مغرب کا خیال آتے ہی دلشاد کی راکھ میں ایک ننھا سا چراغ ٹمٹما اٹھتا۔

مغرب میں کعبہ ہے۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔ لیکن کیمپ کی دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں ہمارے بھائی ہیں، ہماری بہنیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزت ہے۔ وہاں آرام ہے ——— دلشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں رحیم خاں بھی ہو! یہ خیال آتے ہی اس کے جسم کا رواں رواں مچل اٹھتا اور وہ بے چین ہو جاتی کہ پر لگا کر اڑ جائے اور اپنے تھکے ہوئے، دُکھے ہوئے جسم پر اس ارضِ مقدس کی خاک مَل لے۔

ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ، دو مہینے ——— دن گزرتے گئے۔ راتیں بیتتی گئیں اور مغرب کا خوش آئند تصور دلشاد کے سینے میں اُمیدوں کا نور پھیلاتا رہا۔ انبالہ کیمپ کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر ہو گیا تو ایک دن وہ ریل بھی آ گئی جس کے انتظار میں امیدوں کے چراغ ابھی تک جل رہے تھے جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئی، تو دلشاد کو ملّا علی بخش کی یاد آئی وہ بھی اسی طرح ریل میں بیٹھ کر حج کو روانہ ہوا تھا۔ گلے میں ہار تھے، کپڑوں پر عطر تھا اور

گاؤں کے لوگ باجا بجاتے ہوتے اس کے ساتھ اسٹیشن تک آئے تھے۔

——————— !

ریل کے ہر فراٹے کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوئے آبگینے جھنجھنا اٹھتے تھے۔ پہیوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور روح کا ایک بل نکل جاتا تھا۔ جب وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر تار کے کھمبوں کو دیکھتیں جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے، تو انھیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین کا جو چپہ چپہ ان کے نیچے سے نکلتا وہ انھیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔ اگر کہیں گاڑی رکتی، تو ساری کائنات دم سادھ لیتی۔ وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انھیں یہ ڈر لگتا کہ شاید انجن کے سامنے اچانک بڑے بڑے پہاڑ آ گئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھتیں، سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھونے کی کوشش کرتیں، جو مغرب کی سمت سے آ رہی تھی !

لدھیانہ، پھلور، جالندھر ——— امرتسر ——— ہر

منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھلتے گئے۔ ان کی خاک میں سوئے ہوئے نغمے بیدار ہونے لگے۔ وہ گنگنانے لگیں۔ وہ مسکرانے لگیں۔ وہ آنکھیں مَل مَل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی نے بالوں میں کنگھی کی۔ کسی نے دوپٹہ کے ساتھ دانتوں کی مَیل اُتاری۔ کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔ کوئی بچوں کو لوریاں سنانے لگی۔ کچھ عورتوں نے سر سے سر جوڑ کر گیت گائے۔ پیارے پیارے رَس بھرے، دلربا گیت، کہ "اے کالی کملی والے۔ میں تیری یثرب نگری میں آئی ہوں ـــ" مجھے اپنی کملی میں چھپالے۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنالے ـــــــ"

جب گاڑی امرتسر کے اسٹیشن سے نکلی، تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے۔ بس ڈیڑھ گھنٹہ اور! ساٹھ اور تیس نوّے منٹ! یہ ناقابلِ یقین خیال عورتوں کے تن بدن پر شراب کے تیز و تند نشے کی طرح چھا گیا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب پاکر وہ شدتِ احساس سے مفلوج سی ہوگئیں۔ پچھلے بھیانک مہینوں کی یاد زہر بن کر اُن کے سینے میں عود کر آئی۔ ماضی کی ہولناک حقیقت مستقبل کے سہانے ارمانوں پر غالب آگئی

یکایک اُن کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان جوان بھائی اپنے نحیف نحیف ماں باپ، جن کے بے گور و کفن لاشے گلیوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ اپنی اُداس اُداس بہنیں جو کیمپوں میں بیٹھی فرشتوں کا انتظار کر رہی تھیں کہ وہ انھیں اپنے نوری پروں میں چھپا کر لے جائیں۔ دُور، کہیں بہت دُور، مغرب کی طرف ——————— وہ رونے لگیں۔ اُن کے گالوں پر آنسوؤں کے پرنالے بہنے لگے۔ دلشاد بھی رو رہی تھی، بلک بلک کر سسک سسک کر اور آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے ہونٹوں پر پہاڑی چشموں کی طرح اُبل رہا تھا۔ وہ روتی گئی، وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اُس کی پلکوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ایک عجیب سی غنودگی، ایک عجیب سا خمار اس کے رویں رویں پر چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سمندر کی اتھاہ لہروں میں غوطے کھا رہی ہے اور بے شمار سنپولیے اُس کے تن بدن پر رینگ رہے ہیں — رینگ رہے ہیں !!

ربُّ المغربین

مری دنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ دلشاد کے پہلو میں ایک ننھی سی بچی رو رہی تھی۔ صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی درختوں پر چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ گھاس پر شبنم کے موتی چمک رہے تھے، اسٹیشن پر چہل پہل تھی۔ ایک گرم چائے والا کھڑکی کے پاس خوانچہ لگائے دودھ اُبال رہا تھا۔

دلشاد اٹھ کر کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقاہت سے چائے والے سے پوچھا "کیا یہ مغرب ہے بھائی؟"

چائے والا اپنے پیلے پیلے کریہہ المنظر دانت نکال کر ہنسا "کیوں؟ کیا نماز پڑھو گی اس وقت؟"

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی محنت کے صلے میں دلشاد سے ایک چونّی مانگی۔ پھر مایوس ہو کر اس نے دلشاد کو چند غلیظ گالیاں دیں۔ "سارا ڈبہ پلید کر دیا رانڈ نے، ذرا صبر نہ ہو سکا؟ راستے ہی میں جن بیٹھی ——— !" اسٹیشن کی مہترانی جا کر ایک مضبوط سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مل کر دلشاد کو ڈبے سے نکال دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا ٹھیلا کھڑا تھا۔ دلشاد اس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا سٹال تھا۔ تانبے کے چمکدار سماوار سے ابلتے ہوئے چائے کے بھپکے پیچ در پیچ نکل رہے تھے جیسے کسی نازنین کے گیسو ہوا کے دوش پر لہرا رہے ہوں۔ اس کے آگے پھلوں کی دوکان تھی۔ رنگ برنگ کاغذوں پر کندن کی طرح دمکتے ہوئے کیلے سنگترے اور مالٹے سجائے رکھے تھے۔ ایک کٹا ہوا سرخ انار چھابڑی میں پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوروں کے بڑے بڑے خوشے لٹک رہے تھے

دلشاد کا گلا کانٹے کی طرح خشک تھا۔ اس کی زبان پر گدلے گدلے میلے میلے لعاب کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سلگ رہا تھا۔ اس کی کمر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اس کا سارا بدن ایک دُکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح چُرمُر کر رہا تھا۔

دلشاد نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی ننھی سی بچی چوہیا کی طرح اس کے سینے سے چمٹی ہوئی چس چس دودھ پی رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھر سوتی ہی رہی اور مغرب کی سُہانی منزل مقصود کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی سٹیشن کی فلک بوس عمارت کے پیچھے اس کا رحیم خاں اس کے انتظار میں کھڑا ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جمگھٹوں میں کھویا ہوا اُسے تلاش کر رہا ہو جو پلیٹ فارموں پر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

وہ کوشش کر کے اٹھی، کہ لوگوں کے ہجوم کے قریب ہو جائے لیکن اس کے گھٹنے کٹاک سے بج کر رہ گئے۔ اس کی پنڈلیوں میں رعشہ سا آگیا اور وہ سر تھام کر تھیلے کے سہارے پھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوش، خوش شکل جوان لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیے پلیٹ فارم

پر ٹہل رہے تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرے کے پاس سگار تھا جب وہ دلشاد کے سامنے سے گزرتے تو دُور تک پیچھے مڑ مڑ کر اُسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ان کے چکر کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دلشاد کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دلشاد کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ بیم درجا کا ایک عجیب سا تانا بانا اُس کے دماغ پر چھا گیا۔

چمکور کی مسجد میں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا، تو وہ بے بسی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحہ اسے گھورنے والے کے ہاتھ اُس کا گوشت نوچ کھسوٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن ریل میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا سہارا پکڑ لیا تھا، جو مغرب کے تصور سے اس کے دل اور دماغ میں بسی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ سوچنے لگی، کہ شاید یہ خوبصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں، جن کے خون کی کشش انبالہ کیمپ کی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ اس خیال سے دلشاد کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی ناچی۔ وہ تو مسکرانا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے بدن میں درد کی ٹیسوں کا طوفان سا اٹھا ہوا تھا اس لیے وہ باوجود کوشش کے بناوٹی طور پر بھی مسکرا نہ سکی۔ پھر بھی محبت

کا جتنا لوچ اس کا دکھتا ہوا، رستا ہوا جسم اکٹھا کر سکتا تھا، اس نے اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر اُن نوجوانوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔

"انور!" ایک نوجوان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے منہ پر چھوڑ کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

"رشید" دوسرے نوجوان نے گرمجوشی کا جواب گرمجوشی سے دیا۔

انور! رشید!! دلشاد گویا سرشار ہوگئی۔ یہ دو نام اس کے کانوں میں آبِ حیات سا ٹپکا گئے۔ مہینوں سے وہ ایسے مانوس نام سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کے گاؤں کے انور، رشید، محمود، نسیم، خالد، جاوید تو مدّت سے مٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے تصوّر میں اب شمشیر سنگھ امریک سنگھ، کرتار سنگھ، ترلوک سنگھ، پنجاب سنگھ، سورمکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اژدہوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زہر اس کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکا تھا۔ ان کی سڑاند اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی۔ اُن کا وحشی اُبال اس کی ہڈیوں میں درد بن کر رچا ہوا تھا لیکن اب جو اس کے کانوں نے رشید اور انور کے نام سُنے، تو اُسے

یوں محسوس ہوا، جیسے وہ آبِ کوثر سے نہا رہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصفا پانی اُس کے گلے ہوئے، سڑے ہوئے جسم پر گلاب اور کافور کی خوشبوئیں چھڑک رہا ہو ——— اس کی گری ہوئی گردن میں افتخار کا ابھار آگیا۔ اس کے مایوس اور غم دیدہ سینے میں امید و مسرت کی کرنیں پھوٹ اٹھیں اور اس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن دو جوانوں کو اپنے قریب بلایا۔

"یہ کیا جگہ ہے بھائی؟" دلشاد نے پوچھا۔

"لاہور ہے۔" انور نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" رشید نے پوچھا۔

"جہاں قسمت لے جائے۔"

"باپ رے باپ!" انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

"بڑی سپورٹ ہے بھائی!" رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

"آؤ بہن، تم ہمارے ساتھ چلو۔" دونوں ہمزبان ہو کر بولے۔

جب دلشاد ٹھیلہ کا سہارا لے کر اٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

"ارے" انور حیرانی سے اُچھلا۔

"یہ کیا بلا ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"لڑکی ہے جی"۔ دلشاد کچھ ہچکچائی، کچھ شرمائی۔

"بڑی چھوٹی سی ہے"۔ انور نے جائزہ لیا۔

"ایک ہی دن کی ہے جی"۔ دلشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے، کیا نہ کہے۔

"آخ تھو" انور کو اُبکائی سی آئی۔

"لاحول ولاقوۃ" رشید کا جی متلایا

وہ دونوں بھائی قے کرتے کرتے بچے، اور تیز تیز قدم وہاں سے چلے گئے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھڑکیلی سی شلوار اور قمیض پہنے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دوپٹہ اس کے سڈول شانوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر ریل کی پٹڑی کو عبور کیا اور ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس خوبصورت عورت کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے۔

دوپہر کے وقت سٹیشن کی رونق ذرا ڈھل گئی۔ دھوپ میں تمازت

کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دلشاد کے دُکھتے ہوئے جسم کی ٹکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پلیٹ فارم پر دھوپ سینک رہا تھا ان کا چھوٹا سا لڑکا دلشاد کے قریب اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ جب اس نے دلشاد کی ننھی سی لڑکی کو دھوپ میں لیٹے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا، تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لیے گھسیٹ کر لے آیا۔

"ہاؤ ونڈرفل، ممّی، ہاؤ ونڈرفل!" بچہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور مسرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دلشاد کی بیٹی ایک پھٹی سی چادر میں لپٹی ہوئی اپنے ننھے ننھے گھونسے تان کر آسمان کو دکھا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارض و سما کی کونین کو اپنی ٹھوکروں سے دھتکار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس ننھی سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتا تھا، ناچتا تھا اور ہر لمحہ کوشش کرتا تھا کہ وہ اچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لے۔ اُس

اس کی ماں نے اُسے دانتا کہ دوسرے کی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے۔ لڑکا مچل گیا۔

"ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے۔" لڑکے کے باپ نے اُسے چمکارا ــــ

"جھوٹ" لڑکا رو رہا تھا۔

"ہاں، ہاں بچے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے۔" لڑکے کی ماں نے وعدہ کیا۔

"تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لادو گے؟" لڑکا بات پکی کرنا چاہتا تھا۔

"بہت جلد، میرے بیٹے، بہت جلد۔" باپ نے اپنی بیوی کے گاؤن کا جائزہ لیا۔ جس کی گولائی پیٹ کے اوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

"ممی! اس کھلونے کو چاکلیٹ دو!"

"نہیں بیٹے، یہ چاکلیٹ نہیں کھا سکتی۔"

"اچھا تو ممی، اسے ایک عمدہ سا سوٹ دو۔"

"ہاں میرے ڈارلنگ، ہم اسے کپڑا دیں گے۔"

"اور پیسے بھی، میری ممی!"

"ہاں، پیسے بھی میرے ڈارلنگ۔"

لڑکا خوشی سے چیخ چیخ کر پھر تالیاں بجانے لگا اور جب اس کا جی اس کھیل سے بھر گیا تو اس کی ماں نے دلشاد کو اونی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جانے لگے، تو دلشاد نے دل ہی دل میں اس بچہ کو دعا دی، جو پہلی بار اُس کی زندگی میں رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دلشاد کے ہاتھ میں پیسے آ گئے، تو دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ از سرِ نو قائم ہو گیا۔ ایک چائے والے نے اس کے پاس آ کر "گرم چائے" کی ہانک لگائی۔ ایک "گوشت روٹی" والا بھی اس کے نزدیک اپنا خوانچہ لے آیا۔ اور جب دلشاد روٹی کھانے لگی تو ایک کتا بھی زبان نکال اس کے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بنچ پر دو بزرگ بیٹھے رائے زنی فرما رہے تھے۔ ایک کی داڑھی سفید تھی، دوسرے کی حنائی۔ دونوں کچھ دیر سے انگریز

اس کی میم اور بچے کی حرکات پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ جب میم نے دلشاد کو اونی کپڑا اور پانچ روپے خیرات دیے، تو ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان کی داڑھیوں کو پکڑ کر زور سے جھٹک دیا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ"۔ ایک حضرت خفا ہوتے۔ "یہ حرامی اب تک سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں"۔

"ارے میاں قصور ان کا نہیں"۔ دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔ "کیوں نہیں اس کم بخت عورت نے ایسی ذلیل خیرات کو نفرت سے ٹھکرا دیا؟"

"اللہ اللہ آزادی تو ملی، لیکن غلامی کا چسکا نہ گیا"۔

"جاتے کیسے میرے بھائی، جاتے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی جوتیوں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا بار کون اٹھائے؟"

"اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"۔ پہلے بزرگ نے رقت سے الاپا۔

دوسرے حضرت نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصرعے

ارشاد فرمائے۔ جب دلشاد چار آنے کے گوشت، تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دوزخِ شکم کو ایندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرما کر اس کے پاس آئے۔

"اے عورت کیا تم مہاجر ہو"۔ ایک نے خشمگیں انداز سے پوچھا، جیسے زمانۂ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطاب کر رہا ہو۔

"جی نہیں، میرا نام دلشاد ہے"۔

"ارے ہوگا، لاحول ولا قوۃ۔ ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو؟ کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تمہارا کیا کام ہے؟" دوسرے حضرت نے مہارنی کی۔

اے کاش دلشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزلِ مقصود کا نشان ——— کس شاہراہ پر ملے گا۔ اس کے تخیل میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے والی تھی، جس میں اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ، اینٹ اس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تمہاری جیب میں پیسے ہیں ——؟ تمہارے جسم میں تازگی ہے؟ ———

"تم مہاجر ہو"۔ ایک بزرگ نے فتویٰ دیا۔ "تم مہاجر خانے چلی جاؤ"۔

"آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پلتیں، ہاں"

"تم کوئی بچہ نہیں ہو۔ تمہیں خود شرم آنی چاہیئے"

دلشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ مہاجر نام کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ جو کوئی گناہ کبیرہ سرزد کر کے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اُسے ہی پکارا اور سب نے اُسے مہاجر خانے میں چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ ——— مسافر خانہ کے وزن پر۔ ایک دفعہ جب دلشاد اپنے ابا کے ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں حاجی موسیٰ کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے ——— مسافر خانے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں ایک بھٹیارن اوپلوں کی آگ پر ماش کی دال اور چپاتیاں پکا رہی تھی جب دلشاد اس کے پاس چٹائی پر کھانا کھانے بیٹھی، تو بی بھٹیارن نے بہت سا گھی پیاز کے ساتھ بگھار کر اس کی دال میں ڈالا اور گرم گرم روٹیوں پر تازہ مکھن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کو جب ملا علی بخش عشا کی نماز پڑھنے لگا، تو بھٹیارن دلشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیٹ

گئی اور دیر تک اسے مزیدار کہانیاں سناتی رہی۔ کبھی سات بیٹوں والے راجہ کا قصہ، کبھی پریوں کی بادشاہ زادی کا افسانہ۔ کبھی اپنے بھٹیارے کی جیون کہانی بھٹیارن کبھی دفعہ روتی، کبھی دفعہ ہنسی۔ اور آج تک جب دلشاد شہر کی بارونق سڑکوں کا تخیل باندھتی، تو اس کے پردۂ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا عکس ابھر آتا اور اس بھٹیارن کی تصویر بھی جو کبھی روتی تھی، کبھی ہنستی تھی، اور کبھی دلشاد کو گرم گرم چپاتیوں پر مکھن کے پیڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی

مہاجر خانہ ——— شاید مسافر خانہ کا بگڑا ہوا نام ہو جیسے گاؤں والے ہسپتال کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر والے مسافر خانہ کو مہاجر خانہ کہتے ہوں ——— لیکن اس کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مہاجر بھی کوئی نام سا نام ہے بھلا؟ دلشاد تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ ملا علی بخش کی یاد وابستہ تھی جس نے قرآن شریف سے فال نکال کر اسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم خاں کا افسانہ محبت بھی منظوم تھا۔ وہ دلشاد کے ساتھ آباد، بیداد، صیاد کے قافیے باندھ کر بڑے رس بھرے دوہے گایا کرتا تھا۔

مہاجر خانہ ——— جب وہ مہاجر خانے پہنچی تو لاہور کے شانوں پر رات کے گیسو پھیل رہے تھے۔ مہاجر خانے کا افسر ایک چھولداری میں رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد دلشاد کی باری آئی

"نام؟" افسر نے طوطے کی طرح رٹا ہوا سوال دہرایا

"دلشاد"

"عمر؟"

"بیس سال"

"باپ کا نام؟"

"ملا علی بخش"

"زندہ ہے یا مر گیا؟"

"مار ڈالا گیا"

"گاؤں؟"

"چمکور"

"ضلع؟"

"انبالہ"

"شادی شدہ ؟"

"جی نہیں"

"مہاجر خانے کے افسر نے قلم روکا اور خشمگیں نگاہوں سے دلشاد کو گھورا: "یہ لڑکی کس کی ہے ؟"

"جی یہ میری لڑکی ہے"۔ دلشاد ہکلانے لگی: "میری شادی ہوگئی ہے جی، میں بھول گئی جی"۔

افسر کا قلم مشین کی طرح پھر دوات کی طرف گھوم گیا

"سوچ کے بولو، خاوند کا نام ؟"

"رحیم خاں"

"زندہ ہے یا مر گیا ؟"

"جی ——— پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہو۔ خدا کرے میری عمر بھی اسے لگ جائے جی ———"

مہاجر خانے کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ کوئی آٹھ سو فٹ لمبا، پانچ سو فٹ چوڑا۔ ایک کھلا میدان۔ جس کے چاروں طرف کانٹوں والی تار کا احاطہ باندھا ہوا تھا۔ چھت کے لیے آسمان کا لاجوردی سائبان تھا۔ روشنی

کے لیے ماہتاب کی قندیل اور تاروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ تھے۔ ایک کونے میں باورچی خانہ تھا۔ زمین میں کھودے ہوئے عمیق چولہوں پر دال اور گوشت کی بڑی بڑی دیگیں پک رہی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں چولہوں کی آگ دیگوں کے گرداگرد یوں بھڑکتی تھی، جیسے چتاؤں کے شعلوں میں دیوتاؤں کے لاشے جل رہے ہوں۔ آگ کی روشنی میں مہاجر خانے کا وسیع میدان نکھر آیا تھا، جس طرح شفق شام میں نتھرے ہوئے ابر پاروں کی سرخی کسی قبرستان پر غبار خون کی طرح چھا جائے۔ ساری فضا میں ایک غمناک سا ٹھہراؤ تھا۔ ایک ہلکا سا، ایک غیر محسوس سا ارتعاش جس میں لاکھوں سینوں کے کچلے ہوئے ارمان اور ٹوٹے دلوں کی معصوم دھڑکنیں کپکپا رہی تھیں، تھرتھرا رہی تھیں، اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون وجمود کا یہ مصنوعی طلسم یکایک ٹوٹ جائے گا۔ اور ایک زبردست طوفان، ایک بے پناہ زلزلہ، ایک ہولناک چنگھاڑ زمین و آسمان کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیگی۔

دلشاد اپنی بچی کو سینے سے لگائے قدم پھونک پھونک کر چلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں بچا بچا کر پاؤں رکھا جاتا ہے کہ کہیں کسی مقدس

مزار کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کچھ مہاجروں نے بانسوں پر چادریں تان کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنالی ہیں۔ کچھ مہاجر کچی قبروں کی طرح یونہی آسمان تلے بیٹھے ہوتے تھے ——— آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ——— کسی کے پاس چادر تھی، کسی کے پاس کمبل، کسی کے پاس لحاف — دلشاد کے پاس نہ چادر تھی، نہ کمبل تھا، نہ لحاف۔ وہ خود ایک چیتھڑا تھی۔ ایک بوسیدہ سا، ایک فرسودہ سا ٹکڑا، جو اس کے لباس دوشیزگی کی یاد میں باقی رہ گیا تھا — مہاجر خانے میں ایسے سینکڑوں چیتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ سب کے دل میں امید کی لو لگی ہوئی تھی کہ اب وہ اپنی پیاری سرزمین پر آ گئے ہیں۔ اب اس ارضِ مقدس کی خاک ان کے گلتے ہوئے ناسوروں پر مرہم بن کر لگ جائے گی۔ اب یہاں کا متبرک پانی اُن کے رستے ہوئے زخموں کو دھو ڈالے گا۔ اب یہاں کے سورج اور چاند کی تنویریں ان کے چاک دامنوں کو رفو کر دیں گی۔

ایک خالی سی جگہ دیکھ کر دلشاد ٹھہر گئی۔ کچھ دور آگے ایک کہنہ سال ضعیف آدمی ڈیرہ ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ ایک آٹھ دس سال کا لڑکا محمود، ایک گیارہ بارہ برس کی لڑکی زبیدہ، وہ تینوں ایک

مٹی کے پیالے پر جھکے ہوئے روٹی کھا رہے تھے۔ محمود پوچھتا تھا کہ دادا آج سالن میں بوٹی کیوں نہیں؟ زبیدہ اپنے دادا کی وکالت کرتی تھی اور کہتی تھی کہ ہر روز گوشت نہیں کھایا کرتے، اس سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے، دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے۔ ——— لیکن محمود مچل رہا تھا۔ دادا اُسے چمکارتا تھا۔ زبیدہ اُسے ڈانٹتی تھی۔ "کیا میں تجھے اپنی بوٹیاں کاٹ کے دے دوں۔" وہ چھوٹی سی بہن اپنے چھوٹے سے بھائی کو بزرگوں کی طرح ڈانٹتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مختصر سے خاندان کا نگہبان دادا نہیں، زبیدہ ہے۔ اس لڑکی کا شعور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ بیک وقت ایک ننھی سی بہن، ایک ننھی سی بیٹی، ایک ننھی سی ماں کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

"یہیں بیٹھ جاؤ، بیٹی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟" بڈھے دادا نے دلشاد سے پوچھا۔

"جی نہیں ——— میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔"

"جاؤ روٹی لے آؤ باورچی خانے سے۔ تمہارے پاس کوئی پیالہ ہے؟"

"جی نہیں۔ میرے پاس کوئی برتن نہیں۔"

دادا نے اپنا ایک خالی پیالہ اُسے دے دیا۔

"پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟"

"جی نہیں، میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔"

دادا نے اس ویران ہستی پر ہمدردی کی ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ بھی بالکل اسی حالت میں یہاں آیا تھا۔

"باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کمبل مانگ لینا وہاں سے۔"

پھر دادا نے ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ "نو بج رہے ہیں شاید سٹور بابو جاگتا ہو۔"

باورچی نے دلشاد کو دو روٹیاں اور پیالہ بھر دال دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ خیمے میں رضائیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سُرخ سرخ، بھورے بھورے، کالے کالے کمبلوں کی تہوں پر تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ اونی سوئٹر پٹو کے کوٹ، گرم چادریں ——— سٹور بابو سرخ و سفید چھینٹ کی رضائی اوڑھے چارپائی پر لیٹا ہوا اقبال کا شکوہ گا رہا تھا:۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جب اس نے دلشاد کو خیمے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اس کے ترنم کی لے سُست پڑ گئی اور اس نے نہایت خشمگیں انداز سے دلشاد کو گھورا۔

"دفتر بند ہے جی اس وقت۔ صبح آٹھ بجے آنا۔"

"ہمارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ ہم پالے سے مر جاتیں گے۔"

"کوئی نہیں مرتے۔ صبح آٹھ بجے آنا، ہاں۔ دفتر بند ہے اس وقت۔"

دلشاد نے ایک بار پھر التجا کی۔ سٹور بابو جھنجھلا گیا۔

"میں کہتا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح، میں بھی آخر انسان ہوں مشین نہیں ہوں، ہاں صبح آٹھ بجے آنا۔" اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکڑ کر شکوہ گانے لگا — آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

جوں جوں رات بھیگتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہوا کے جھونکے تیر و نشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زمین کی نمی زہر آلود کانٹوں کی طرح جسم میں چبھتی تھی۔ دادا کے پاس ایک کمبل تھا۔ اس نے اسے آدھا نیچے بچھا کر محمود اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کمبل اُن کے اوپر ڈال دیا تھا۔

یا خدا

وہ خود ایک پتلی سی چادر اوڑھے زمین پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ دشاد کے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو اُونی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ لیٹ جاتی تھی۔ کبھی اُٹھ بیٹھتی تھی — کبھی کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروٹ، ہر پہلو سردی کا اثر سانپ کے زہر کی طرح اس کی ہڈیوں میں سرسراتا ہوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ شاید اگلے لمحے وہ برف کے ٹکڑے کی طرح جم کر گر جائے گی۔

کچھ دور آگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر ممکن طریقہ سے اپنی چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس بھی نہ کمبل تھا، نہ لحاف، نہ چادر۔ لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس کے سینے میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جیسے بہت دُور، افق لکیر سے پرے، اونٹوں کا ایک کارواں کسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں چلا جا رہا ہو، چلا جا رہا ہو، رواں رواں، دواں دواں ..... جیسے جیسے سردی بڑھتی گئی، لڑکی کے سینے کی گھنٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناؤ آگیا جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی لڑی تھام کر آپس میں رسہ کشی کر رہے ہوں۔

اس کی ماں گھبرا گئی۔ بے بس ہو گئی، لاچار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ زمین پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے لحافوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر وہ عورت سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ڈرے ہوئے جھجکتے ہوئے، شرماتے شرماتے اس نے اپنے کپڑے کھول کر اپنی ٹھٹھری ہوئی بیمار بچی کو ان میں لپیٹ لیا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی لہرائی اور اس جوان عورت کا برہنہ جسم کائنات کے ذرّے ذرّے کو للکارنے لگا کہ دیکھو دیکھو یہ لاجواب ساعت بیت نہ جاتے۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔ لیکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے جس کے کپڑوں میں اس کی مرتی ہوئی بیٹی لپٹی پڑی ہو اور بڑا سخت پالا پڑ رہا ہو اور سٹور میں گرم کمبل اور لحافوں کے ڈھیر ہوں۔ اور سٹور بابو رضائی میں لپٹا ہوا "شکوہ" گا رہا ہو اور ——

—— عورت کا عریاں جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ رات کی ظلمت میں روسیاہی کی کالک اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ آسمان پر جو تارے ٹمٹما رہے تھے آنکھیں موند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے لحافوں کے بیچ سے جھانک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹا

جو آسمان پر بے پروائی سے بکھری ہوئی تھی، سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہو گئی۔ اور بادلوں کی پلکوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

ٹپ ٹپ ٹپ —— ٹپ ٹپ پٹ —— بوندیں برس رہی تھیں ٹھٹھری ہوئی ہوا کی سن سن سسکیوں کی طرح آہیں بھر رہی تھی۔ جہاجر خانے کے میدان میں زندگی کی ایک کمزور سی لہر جاگی، کچھ بچے رو دیے، کچھ عورتوں نے شور مچایا، کچھ مردوں نے ڈانٹ بتائی اور پھر ایک سناٹا چھا گیا۔

مینہ کی بوندیں دلشاد کے بدن میں بندوق کے چھرّوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے امریک سنگھ، ترلوک سنگھ سور ملکھ سنگھ، دربار سنگھ کی کرپانیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی فلالین کے گرم ٹکڑے میں بھی نفوذ کرتا گیا اور اس میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان سردی سے کپکپانے لگی۔ دلشاد نے سوچا کہ اگر وہ دادا اسے پوچھ کر اپنی لڑکی کو محمود اور زبیدہ کے کمبل میں لٹا دے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سہارا مل جائے۔ اس نے دادا کے گھٹنے کو ہلایا۔ وہ اپنی میلی سی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ دلشاد نے اُسے شانوں سے ہلایا، بانہوں سے ہلایا۔ گردن سے جھنجھوڑا، ہاتھ کھینچے، لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس

سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اس کی رگوں میں جم کے رک گیا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں سردی سے اکڑ کر لوہے کی سلاخوں کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پو پھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمریں مجسمہ چاندی کی طرح جھلملایا۔ یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرتی ہوئی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے لگی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کار نے مرمر کو تراش کر یہ خوبصورت بت بنائے ہیں۔ عورت کے کسے ہوئے دودھیا بدن پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس کی گھنی زلفیں کالے ناگوں کی طرح بپھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی جمی ہوئی تھی، جیسے اس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی منجمد ہو کے رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ محترم کمبلوں کا پلندا اٹھا کر لے آئے۔ ایک کمبل انھوں نے دادا پر ڈال دیا۔ دوسرا عورت کے ننگے بدن پر، تیسرا اس کی بچی پر، چوتھا۔ اور اسی طرح وہ میدان میں بکھری ہوئے لاشوں پر نرم نرم گرم گرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے۔ جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف

دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موت کے تصور میں ایک ان دیکھی اَن جانی اَن سمجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب برضا و رغبت وہیں مرجاتے تاکہ مہاجر خانے کے مہتر ان پر بھی اُونی کمبل ڈالتے جائیں۔ اور ان کے کپکپاتے ہوئے گوشت اور ٹھٹھرتی ہوئی ہڈیوں کو ذرا سا سکون، ذرا سی گرمی، ذرا سا آرام میسّر آئے۔

محمود مچل رہا تھا کہ دادا کو وہ لوگ اٹھا کر کہاں لے گئے؟ زبیدہ اُسے سمجھاتی تھی کہ دادا، ابا اور امی کو بلانے گئے ہیں — وہ کب آئیں گے؟ — وہ بہت جلد آجائیں گے، میرے محمود، وہ تو بس آتے ہی ہوں گے۔ ابّا اور امّی کہاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ میاں سے ملنے گئے ہیں وہ اس کے دربار سے تمہارے لیے عمدہ عمدہ کھلونے لائیں گے۔ شیشے کا لٹو، ربڑ کی گیند، چابی والی موٹر، نئے بوٹ، تلّے دار ٹوپی —— محمود کا تخیل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھڑ کر اُسے ٹالتی تھی اور جب کبھی محمود اِدھر اُدھر کھیل میں لگ جاتا تو وہ نظر بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

مہاجر خانے کی مشین بائیسکوپ کی طرح چل رہی تھی۔ صبح سے شام تک اس کے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بڑے بڑے دبدبے والے رئیس اور نواب آتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں والے حکام آتے تھے۔ سرسراتے ہوئے ریشم و کمخواب میں ملبوس کلیوں کی طرح کھلے ہوئے حسن میں سرشار گلاب اور چنبیلی کے عطر میں مہکی ہوئی بیگمات آتی تھیں وہ سب بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کی اشک شوئی کرتے تھے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی پیٹھ ٹھونک کر اُن کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکسار موٹریں انھیں مہاجر خانہ سے واپس لے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لاتا تھا، کوئی کپڑے بانٹتا تھا، کوئی پلاؤ اور قورمے کی دیگیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تو اس کے چہرے پر فخر و مسرت کی سُرخی پھیل جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ایسے سامان پیدا کر دیے جن کے طفیل اس ناچیز کو بھی مقدور بھر خیرات کرنے کا موقع نصیب ہوا ——— دلشاد سوچتی تھی کہ جب کوئی جوان مرد محمود اور زبیدہ کا قصہ سنے گا تو سٹور بابو کو کان سے پکڑ کر گولی سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کڑاکے کی سردی میں بھی دادا کو صرف ایک

ہی کچل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی دبدبے والے، طنطنے والے بلند اقبال لوگ اس کی اپنی رام کہانی سنیں گے تو ان کا خون کھول اُٹھے گا۔ ان کی غیرت کو شدید چوٹ لگے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریک سنگھ، ترلوک سنگھ کرتار سنگھ، دربار سنگھ کی تلاش میں چل نکلیں گے ـــــ لیکن سننے والے سنتے گئے، سنانے والے سناتے گئے۔ دن میں مٹھائی اور پلاؤ بٹتا گیا رات کو زمستانی ہوا کی شمشیر اپنے وار کرتی گئی اور مہاجر خانہ کا بائیسکوپ بدستور چلتا گیا۔ ایک سین کے بعد دوسرا سین، دوسرے سین کے بعد تیسرا سین ـــــ نہ آغاز نہ انجام، ایک مسلسل اور پیچیدہ نظام ترحم کہ جس میں انسان، انسان کا رازق بننے کے لیے بے قرار ہو، بے چین ہو اور اس بازی میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے ہر قسم کا داؤ ہر قسم کا پیچ کھیلنے پر تُلا ہُوا ہو۔

ایک صاحب بڑے مخیّر تھے۔ بدن پر خوشنما سوٹ، سر پر ترچھی ٹوپی آنکھوں پر سونے کے فریم والی سبز عینک، اگلے دانتوں میں سنہری کیلیں، منہ میں پائپ، انگلیوں میں لعل اور یاقوت کی بیش بہا انگوٹھیاں ـــــ وہ گھنٹوں مہاجر خانہ میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے۔ کسی کو مٹھائی کی گولیاں۔ کسی کو چاکلیٹ ـــــ دلشاد پر بھی ان کی خاص

نظرِ عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس کی بچی کے لیے سُرخ اون کا دیدہ زیب موٹر لائے۔ دوسرے روز انھوں نے رحیم خاں کی تلاش کرنے کا وعدہ فرمایا اور کچھ دنوں کے بعد وہ دلشاد کے لیے ایک جانفزا عید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خاں کا پتہ مل گیا ہے۔ بچارا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور، لیکن دلشاد کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک بارِ زیست اٹھائے بیٹھا ہے۔ دلشاد کی نظر میں دنیا گلنار ہو گئی۔ حاجر خانے کی زمین پر پھول ہی پھول اُگ آئے۔ اس کے بدن میں سلگنے والا زہر کافور کی طرح مشکبار ہو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں ارمانوں کا بے پناہ ہجوم چھپائے مسٹر مصطفےٰ خاں سیمابی کی موٹر میں آ بیٹھی۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر گزر رہی تھیں۔ یہ باغ جناح ہے، یہ گلستانِ فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ ملکہ معظمہ کا بت ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین ریسٹوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد کا چوک ہے۔ اس گلی میں انار کلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے، وہ مسجد ہے ..... یہ مصطفےٰ خاں سیمابی کا مکلّف بنگلہ ہے۔ نوکروں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔ "آج کرے جی بھر کے سنگار، تو بے جانا ہے — آج کرے جی بھر کے سنگار"

دلشاد کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک

انوکھے سرور کا ترنم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر رحیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلہ کی ہوا میں اس کی دلاویز سانس بسی ہوئی ہو ——— دلشاد کی نظرِ عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرہ ذرہ مکہ اور مدینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس منارے تعمیر ہو گئے ——— ایک نوکر نے اسے ایک پلیٹ میں پلاؤ، ایک میں پالک اور گوشت، ایک میں مٹر اور قیمہ، ایک میں کیوڑے میں لگائی ہوئی فرنی لا کر دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب کھا گئی ——— وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کی رُوح اپنے رحیم خاں کے استقبال کے لیے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم کو ابھی تک کتے چچوڑ رہے تھے ——— مصطفےٰ خاں سیمابی ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کے سامنے بھوکے گِدھ کی طرح منڈلا رہا تھا۔ میز پر سکاچ وسکی کی بوتل جگمگا رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا، کہ میری جان، آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی مظلوم ہو ——— تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر انسان ہوں میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ بنا کے رکھوں گا۔ تمہارا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔ شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی ہستی

کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ! میری جان' آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب تم اپنے آزاد وطن میں آگئی ہو — اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ ہمارا وطن ہے — یہ ہمارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!!

——— دلشاد کے گلے میں ملّا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی۔ جب مصطفےٰ خاں سیمابی کی زبان لپک لپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی تو دلشاد کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگ اسود کو بوسہ دے رہا ہے ——— '

دو چار دن میں جب مصطفےٰ خاں سیمابی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے تو دلشاد پھر مہاجر خانے واپس آگئی۔ ننھا محمود شیشے کا لٹو چلا رہا تھا۔ اس نے تتلا تتلا کر' تالیاں بجا بجا کر دلشاد کو سمجھایا کہ زبیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی — دادا میاں نے شیشے کا یہ لٹّو بھیجا ہے۔ یہ ربڑ کی گیند' یہ رنگ دار مٹھائی' آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوں پوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی — تلّے دار ٹوپی لائے گی ——— '

لاہور، لاہور نہ تھا، مدینہ تھا۔ لاہور والے، لاہور والے نہ تھے۔ انصار تھے ـــ نہیں! وہ تو شاید انصارِ مدینہ سے بھی کچھ درجہ افضل تر تھے یہاں دلشاد کے لیے ہر روز ایک نیا رحیم خاں پیدا ہو جاتا تھا ـــ زبیدہ کے لیے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا۔ بیٹیوں کے لیے نئے نئے باپ تھے۔ بہنوں کے لیے نئے نئے بھائی ـــ جسم کا رشتہ جسم سے ملتا تھا، خون کا رشتہ خون سے ـــــــــــــــ،

رَبُّ العالمین

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

کراچی

دلشاد نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گہما گہمی تھی ریفیوجی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھی۔ سارا اسٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بادلوں کی طرح چھٹ گئی۔ پلیٹ فارم پر کچھ قلی، کچھ باہر جانے والے مسافر، اور کچھ ٹکٹ چیکر باقی رہ گئے۔ آن کی آن میں ریفیوجیوں کا جم غفیر بے مایہ قطروں کی طرح کراچی کے محیط بے کراں میں غرق ہو گیا، جیسے سمندر کی تیز و تند لہر ساحل کے خس و خاشاک کو اپنے تموّج میں بہالے جائے یا جیسے سورج کی کرنیں

رب العالمین

شبنم کے موتیوں کو اپنے دامن میں چھپالیں یا جیسے شراب کا نشہ دل کے گوشے میں لرزندہ اندیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا دے یا جیسے کسی گلتی ہوئی، سڑتی ہوئی لاش کا تعفن گلاب اور موتیے کی شمیم کو اپنے سینے کے اندر جذب کرے،

منوڑا آئی لینڈ تیز تیز قمقموں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے ــــ کلفٹن بیچ چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ سمندر کی لہریں ساحل کو چھیڑ چھیڑ کر ایک مدہوش سا رباب بجا رہی ہیں۔ لہروں کا پانی ریتلے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نقرئی فواروں کی طرح جھلملا رہا ہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خنکی ایک نرم سی ملائمت ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر مخمور سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔

چار جوان وسکی کے جام بھر کر سوڈا ملا رہے ہیں۔ "ہائے ہائے دلّی" ایک نے سینے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

"سواد رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے۔ ہائے ری دلّی" دوسرے نے واویلا کیا۔

"کون جائے ذوق یہ دلّی کی گلیاں چھوڑ کر ــــــــــ

ہائے دلی، تیری خاک پاک کی کشش" تیسرا رانوں پر تھپڑ مار مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سنجیدہ رہا۔ وہ وسکی کا جام ہونٹوں سے چپکائے مراقبے میں گیا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زور شور سے دلی کی نوحہ خوانی شروع کی، تو وہ چونکا —— "ایں؟ یہ تو وہی سالی کراچی رہی۔ واللہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاوڑی بازار میں چہل پہل ہے۔ بی چاند جان کا بالاخانہ ہے اور وہ ساقی مہوش اپنی حنائی انگلیوں میں ساغر اٹھائے آرہا ہے' لارہا ہے' آرہا ہے' لارہا ہے —"

ہائے ہائے دلی! ہائے ہائے دلی! ہائے بی چاند جان' والے بی چاند جان —— وہ چاروں ایک فصیح و بلیغ مرثیے کی دھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ لوٹ کر اپنی جنت گم کردہ کا ماتم کرنے لگے۔

کچھ دور پرے ایک مقطع و متشرع بزرگ پان چبا رہے تھے۔
ان کے آگے چند عقیدت مند دو زانو بیٹھے تھے۔
"دلی گئی، دلی والے گئے، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا
"پان لاؤ" بزرگ نے فرمایا۔

اُن کی خدمت میں پان پیش کیا گیا۔

"تمباکو تو اچھا ہے بھئی"۔ بزرگ نے رائے دی: "کہاں سے لائے؟"

کسی نے عرض کیا، ۲۹ روپے سیر ہے، لکھنؤ سے منگوایا تھا۔

"ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی"۔ بزرگ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو ازسرِنو پکڑا۔ "دِلّی والے گئے، کیوں؟ جانتے ہو بھلا کیوں؟"

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں؟ ان کے چہروں پر کیوں کی سوالیہ علامت ٹھپہ بن کر لگ گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا۔ "وہ لال قلعہ۔ وہ جامع مسجد، وہ قطب مینار وہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دُعا سننے کے لیے ترس رہی ہے۔ غالب کا مزار، شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیا، کا مرقدِ نور ——— ——— سب چلے گئے۔ سب ہاتھوں سے نکل گئے۔ تم کھو گئے اپنے نصیب، میں کہتا ہوں، اپنے اعمال، ہمارے اپنے ناگفتہ بہ اعمال، میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ ——— پان لاؤ"

پان حاضر کیا گیا۔

"میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر"

" دھت تیرے کی "۔ وسکی والی پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا تھا۔" چاندجان میری تھی' وہ مجھ پر عاشق تھی۔ وہ تیرے منہ پر تھوکتی بھی نہ تھی ۔۔ ہاں ———— "

دوسرا جوان سوڈے کی بوتلیں اور خالی گلاس جمع کر کے ایک عملی سا جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر اُلٹا کھڑے ہونے کی مشق فرما رہے تھے۔ ایک پارسن لڑکی ان کی حرکات پر قہقہے لگا کر فضا میں ایک لذیذ سا ترنم' ایک پیارا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے نہانے کا رنگین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس بیدنگ کاسٹیوم میں اس کا چھریرا بدن قوس کی طرح تنا ہوا تھا ———— بزرگ فرما رہے تھے ———— پان لاؤ

چیف کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان مہاتما گاندھی کا بت پہرے پر چوکس کھڑا ہے کہ کہیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں۔ دو سائیکل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نے اس کی لاٹھی چھیننے کی کوشش کی' دوسرے نے اس کی عینک کو اڑانا چاہا۔ جب

وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ایک نے اپنی رومی ٹوپی اتار کر بُت کے سر پر رکھ دی اور وہ خوش خوش وہاں سے چل دیے کہ انھوں نے چپکے چپکے اس بت کو مسلمان کر لیا۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشنما کوٹھی کے سامنے چار اونٹ گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی ہیں۔ لوہے کے ٹرنک، چمڑے کے سوٹ کیس، لکڑی کی پیٹیاں ——— سامان میں ایک طوطے کا پنجرہ بھی ہے۔ طوطا مرچ کی پھلیاں کھا رہا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے، تو وہ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ لو سالو! میں بھی چلا —— اب میں دیکھوں گا تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو ———— ؟

قصبہ ہوٹل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے۔ ہوٹل کے مینیجر نے سٹیج پر آ کے اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدنی قائداعظم ریلیف فنڈ میں دی جائے گی، لوگوں نے گرم جوشی سے تالیاں بجائیں۔

"میرا جی کراچی سے اُکتا گیا ہے"۔ ایک دیدہ زیب بیگم نے شیری کا گلاس لبِ لعلین سے لگا کر کہا "چلو ڈیئر کچھ روز کے لیے بمبئی گھوم آئیں"۔

اس کا ساتھی شمپین پی رہا تھا "اب تو بمبئی بھی مرحوم ہو گئی بیگم — سالی کانگرس اس پیرسِ صغریٰ کو راہب خانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے، نہ وسکی، نہ شیری، نہ جن نہ شمپین — اب سنتا ہوں کہ ریس پر بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے"

"ارے ہاں"! بیگم کو ایکا ایکی یاد آیا "ابھی اگلے روز پروفیسر گھنشام کا خط آیا تھا۔ پروہیبشن کے ہاتھوں بے چارہ مجبور ہو گیا ہے۔ ایک کیس وسکی منگوائی ہے، کسی طرح بھجوا دو، ڈیئر"۔

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے سرگوشی کر رہا تھا "مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں"۔

"مجھے تین" دوسرے نے کہا

"پارسی لڑکیاں، اور مسلمان عورتوں کے برقعے"۔

"مجھے برقعے والیاں بھی پسند ہیں"!

"واللہ بڑے کور مذاق ہو۔ ان مدقوق عورتوں کو کون چاہے گا بھلا"!

"انھیں میں چاہتا ہوں۔ یسوع مسیح کی قسم، مجھے یہ بیمار حسن پسند ہے۔ پیلے پیلے گالوں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں، اس پر غازے کا غبار ——— خزاں کے موسم میں گلاب کی پتیاں ——— ہائے میں نے ایسا حسین امتزاج کہیں نہیں دیکھا ——— بوائے دو سوڈا دو وسکی۔"

"ایک ہی بات ہے تم پلاؤ یا میں پلاؤں ——— ہمارے دونوں ملکوں کا بلند نصب العین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے ——— تمہاری صحت کے لیے۔"

ایک مسلمان ایڈیٹر لیمن سکوائش سے جی بہلا رہا تھا۔ موقع پاکر وہ شراب اور کپڑے کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور میں ولایتی شراب کی کھپت پہلے سے تگنی ہو گئی ہے؟" ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لیے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔

"غلط" تاجر نے گرمجوشی سے تردید کی۔ "بالکل غلط، آپ بھی کیسی عجیب افواہیں لے اڑتے ہیں۔ تگنی تو کیا اگر دگنی بھی ہو جائے تو غنیمت ہے۔"

"افسوس" ایڈیٹر نے اصرار کیا۔ "کیا یہ امر اس نئی اسلامی حکومت

کے لیے شرمناک نہیں ؟"

"پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا اور مسلم ممالک میں سب سے بڑا ملک ہے"۔ تاجر نے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"کیا یہ امر اس سب سے بڑے مسلم ملک کے لیے شرمناک نہیں ؟" ایڈیٹر صاحب برابر مُصر تھے۔

"بقلہ" تاجر نے دسکی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا: "آپ ریاست بنا رہے ہیں۔ مسجد نہیں ——————"

"وہ کالے کالے بُرقعے"۔ دوسرے غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری پہلے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے کہہ رہا تھا۔ "سُرخ و سبز ریشم کے سَرسَراتے ہوئے نقاب، برقعوں کی اوٹ میں جھانکتے ہوئے گول گول، پیلے پیلے، لال لال چہرے، سڈول بانہیں۔ ریشم کی تہوں سے جھلکتے ہوئے مخروطی ہاتھ —— —————— کنواری مریم کی عصمت کی قسم، میں نے ایسے برقعے کہیں نہیں دیکھے۔ جب میں انھیں الفنسٹن سٹریٹ کی دکانوں میں بجلیاں گراتے دیکھتا ہوں، یا گاندھی گارڈن کے سبزے پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے پاتا ہوں، تو میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں گر جاؤں

اور اُن کے نازک اور سُبک پاؤں مجھے اپنی ٹھوکروں سے روندتے چلے جائیں، روندتے چلے جائیں" ——————

"بوائے دو پگ وسکی اور سوڈا" پہلے نے آواز دی۔

"اس بار میری طرف سے۔ بوائے! دو سوڈا، دو وسکی" دوسرے نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے، تم پلاؤ، یا میں پلاؤں — ہمارے بہادر ملکوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدوش مہاجرین کی یکساں مدد کریں گے"

"یہ دوّنی کھوٹی ہے، جی" بس کے کنڈکٹر نے کر ختگی سے کہا —
"اسے بدل دو"

یہ دوّنی میں نے نہیں بنائی" پنجابی پسنجر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"میں یہ دوّنی کوئی دِلّی یا لکھنؤ سے نہیں لایا۔ میں تمہیں ہرگز دوسری دوّنی نہ دوں گا"

کنڈکٹر نے بس روک دی" جب تک تم مجھے دوسری دوّنی نہ دو گے

یہ بس آگے نہیں جائے گی۔"

کچھ پنجابیوں نے کنڈکٹر کو چند فصیح و بلیغ گالیاں دیں: "سالے سندھی، مفت کا پاکستان مل گیا سالوں کو، ہم بھی دو دن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں گے، ہاں۔"

کنڈکٹر اور ڈرائیور باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے: "سالے پنجابی، پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ سر پر ہی چڑھے آتے ہیں، سؤر کے بچے، جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے یہاں۔"

ایک ہندو راہ گیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اس نے کنڈکٹر اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔

دو بنگالی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔

"لارنس روڈ کتنی دُور ہے جی؟" ایک نے پوچھا

"یہی کوئی دو فرلانگ اور ہوگی۔" دوسرے نے اندازہ لگایا۔

"آؤ ٹہلتے ہی چلیں۔"

جب وہ دونوں بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انھوں نے دونی والے حادثے پر جی کھول کر تبصرہ کیا: "لڑنے دو، سالے سندھیوں

اور پنجابیوں کو، کہتے ہیں پاکستان کی زبان اُردو ہوگی۔ چھی، گویا شہر نو بنگلا بھاشا ہماری قومی زبان ہی نہیں ... چھی ————"

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا، ایک چھابڑی والے پر گرج رہا تھا۔ "تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں آتی ہیں ———— ہاں "۔

"ابے چل، ہوٹل کے بچے"۔ چھابڑی والا اکڑ رہا تھا۔ "یہ پٹڑی تیرے باوا کی ہے؟"

ایرانی نژاد ہوٹل والے نے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر سے کیلوں کی چھابڑی الٹ دی۔ چھابڑی والا لپک کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

ایک کانسٹبل نے آکر چھابڑی والے کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ "سالے حرامی کتنی بار کہا ہے، یہاں بکری مت کرو لیکن سنتے ہی نہیں حرامزادے چلو، تھانے چلو"۔

چھابڑی والے نے گڑگڑا کر خوشامد کی، کہ داروغہ جی، میں اجمیر شریف سے آیا ہوں۔ میرا گھر بار سب لُٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ

ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر یہاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔

لیکن قانون، قانون ہے۔ قانون کی نظر میں نہ اجمیری کا امتیاز ہے نہ لاہوری کا۔ نہ اندھی بہن کی تمیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانسٹیبل نے اپنا فرض منصبی بڑے احسن طور پر انجام دیا اور چھابڑی والے کو آگے لگا کر تھانے لے گیا ——— جب تھانیدار نے اندھی بہن کی تفصیل سنی تو اُسے کانسٹیبل کی نالائقی پر بڑا غصہ آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن کو بھی ساتھ ہی لیتا آیا ———

"دو اور دو چار ——— چار اور تین سات ——— سات اور نو کے ہوئے؟" چیلا رام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا۔

خوشی محمد دلال چائے سے مکھی نکال کر چمچہ چھٹک رہا تھا۔ ادھ موئی مکھی کو فرش پر گرا کے اس نے چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔

"سات اور نو سولہ" چیلا رام نے خود ہی حساب لگایا۔ "میں نے کہا "استاد، سیزن بُرا نہیں رہا۔"

خوشی محمد دلال نے اپنا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ سمیٹ کر چائے کا ایک اور

لمبا سا گھونٹ لیا۔

"سچ پوچھو دوست تو بڑا کرارہ سیزن لگا تھا۔" چیلا رام کے گالوں کی کچوریاں خوشی سے پھول رہی تھیں۔ "ایک سیزن میں سولہ چھوکریاں! رام قسم میں نے تو ایسا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا۔"

اطمینانِ قلب کے اظہار کے طور پر چیلا رام نے چاند تارے والی جناح کیپ اتار کر اپنی گنجی چندیا کو زور زور سے سہلایا۔

خوشی محمد کا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور بھی لٹک گیا۔ اور ردِّ عمل کے طور پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔

"تم سالے قسمت کے دھنی ہو۔" خوشی محمد منمنایا۔ "چھوکری پر چھوکری اتارتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔"

"تین چھوکریاں! تھو!!" چیلا رام نے طنزاً ریسٹوران کے فرش پر بلغم کا ایک بڑا سا غلغہ تھوک دیا۔ "کالی کالی پور نہیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا تھو ——— میرے پاس بڑے انمول دانے تھے، یار... گرم گرم، سخت سخت پنجابنیں۔ نازک لچکدار دِلّی والیاں اور پھر وہ پٹیالے والی جٹنی، ہائے ہائے ہیرا تھی، خوشی محمد ہیرا!"

چیلا رام نے ایک کھارا بسکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالا۔

"وہ سالا برادن اسے پورٹ سعید لے گیا۔ کہتا تھا، بڑا کام دے گی وہاں ——— میں نے کہا خوشی محمد، یہ پورٹ سعید کس طرف ہے؟"

"ہوگی کہیں"۔ خوشی محمد کا بیوپار ذرا مندا تھا۔ "چائے منگواؤ اب تو کوئی سالی ریفیوجی ٹرین بھی نہیں آتی۔"

گرم چائے کے دوسرے کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ چیلا رام دلّال اپنے انمول دانوں کا حساب لگا رہا تھا۔ جو اس کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قاہرہ ——— لندن ——— پورٹ سعید ——— نہ جانے اس کے بیش قیمت تحفے کس کس شبستان کی زینت بنے ہوئے تھے کسی دلکدار آرامگاہ میں اس پٹیالے والی جٹنی کا جسم بھی ریشم اور کمخواب کے گاؤ تکیے کی طرح سجا ہوا ہوگا ——— چیلا رام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوئیں سر اٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا، کہ وہ پَر لگا کر پورٹ سعید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ سالے برادن کے منہ پر مار کے پٹیالے کی جٹنی کو واپس لے لے اور اس کے گٹھے ہوئے

مخملیں گاؤ تکیئے ایسے جسم کو بانہوں پر اٹھا کر بھاگ آتے، طوفانوں سے لڑتا ہوا، سمندر کی لہروں سے ٹکراتا ہوا، پہاڑوں کی چھاتی کو چیرتا ہوا ——

خوشی محمد دلال کی دنیا میں غم اور غصّے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ سارے ریفیوجی ہوائی جہازوں میں بھر بھر کر لائے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر ٹرینیں لدی آتی تھیں —— لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ ہر روز اخباروں میں نئی نئی خبریں پڑھتا تھا —— دلّی میں خون —— کانپور میں خون —— کلکتے میں خون —— احمد آباد میں خون —— اجمیر میں خون —— لیکن اس سارے خون کے ریلے میں ایک ریفیوجی ٹرین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی محمد دلال کو اس بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہوم سی امید کا سہارا لے کر چھ پیسے کا خون کیا اور اخبار کی جلی سرخیوں پر للچائی ہوئی نظر دوڑائی۔ اخبار بیچنے والا چھوکرا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا "اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی —— جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا —— اب تو ——"

خوشی محمد دلال نے ہمہ تن شوق ہو کر خبریں پڑھیں۔ کشمیر کی جنت میں بھی دوزخ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔

پھولوں کے دامن میں شرر جل رہے تھے۔ نسیم بہار کی جگہ ڈوگروں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے، ہزاروں مر رہے تھے۔ ہزاروں مینڈکوں کی طرح چھپ چھپ کر، چوہوں کی طرح رینگ رینگ کر اس آتشکدۂ جہنم سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے چیلا رام کی ران پر زور سے ہاتھ مارا: "اب تو کشمیر میں بھی لگ گئی، میرے یار۔ میں نے کہا، چیلا رام، ذرا سُن تو"

چیلا رام پورٹ سعید کے تصوّر میں مگن تھا۔ "پھر تو سیب مہنگے ہو جائیں گے؟" اُس نے بے توجہی سے پوچھا۔

لیکن خوشی محمد میں شاعری کی روح حلول کر آئی تھی۔ اس نے چٹخارے لے لے کر کشمیر کی نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔ خوبصورت رنگین، گلعذار عورتیں ——— جن کے گالوں میں سیب ہوتے ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتیاں۔ ہونٹوں پر انگور کا رس۔ آنکھوں میں ڈل کی لہروں پر رقصندہ کنول۔ گلے میں پہاڑی جھرنوں کا سرود۔ انگ انگ میں گلاب اور موتیے کی رنگت۔ زعفران کی بھینی بھینی مہک ———،

چیلا رام دلال کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور

خوشی محمد کے لیے اس نے چائے کا تیسرا کپ بھی منگوایا۔ پھر وہ سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کشمیر کے سیزن کی امید افزا رعنائیوں میں کھو گئے ــــ

ہوا کے تھپیڑوں سے بادباں لہرایا۔ موجوں میں ایک ہلکا سا تلاطم اٹھا ــــ کشتی ڈگمگائی اور وہ سہم کر سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔

سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھاٹا سا اُٹھا اور پان کی پیک جو کچھ عرصہ سے اُس کے منہ میں جمع ہو رہی تھی، بے اختیار بدرو کے گندے پانی کی طرح بہ نکلی۔

بوڑھا ملاح بڑی سلگا کر مسکرایا: "کشمیر سے آئی ہے سیٹھ، اندھی ہے۔ بچاری، ابھی ڈرتی ہے، بولو۔ کس طرف چلوں؟ پیرس یا دنیس؟"

سیٹھ قائم علی دائم علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یوں بھی اس نے پیرس کے متعلق بڑی دلاویز باتیں سُن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس چھوٹی سی ڈگمگاتی ہوئی کشتی میں اتنے لمبے سفر پر جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا چنانچہ جب ملاح نے اسے پیرس یا دنیس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوکھلا گیا۔

چالاک ملاح اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرایا "گھبراؤ نہیں سیٹھ، دُور نہیں

لے جاؤں گا، ہا! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو مر جاؤ گے، ہا!"

کیماڑی کی بندرگاہ میں خاصی چہل پہل تھی۔ اتوار کی چھٹی منانے والے ہجوم اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منوڑا جا رہا تھا، کوئی سینڈ پٹ آئی لینڈ ——— اور ایک جہاز بمبئی جانے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں رنگین ساڑھیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ لوگ دوربینیں آنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا، تو کچھ لوگوں نے اپنے سروں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں پھینک دیں اور ہوا میں گھونسے لہرا لہرا کر "جے ہند" کا نعرہ لگایا۔

کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب لہروں کے تلاطم پر کشتی کا سینہ ڈگمگاتا تو اسے اپنا ہلکا پھلکا شکارا یاد آتا، جو اسی طرح ڈل اور وولر کی نازک لہروں پر تھرتھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اُسے قے آ گئی ——— اُف! کتنا کڑوا پانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور چشمہ شاہی کا پانی — ہائے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سُرخ؟

نیلا ہے یا سبز؟ لیکن ہائے اس کی آنکھیں! ایک دن تھا کہ اس کی غلافی آنکھوں میں جھیل و دلر کی لطیف نیلاہٹ اور پکے باداموں کی نازک راحت ہوا کرتی تھی لیکن اب ان کی جگہ گہرے گہرے زخم تھے۔ جیسے دو اندھے اور تاریک کنویں کسی دُور دراز ویرانے میں کھوئے پڑے ہوں ـــــ اب وہ اندھی تھی، بے بصر تھی، ایک بہادر ڈوگرنے اپنی سنگین سے اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے طلسمی رنگ محل مسمار کر دیئے تھے۔

ساحل کے ہنگامے سے دُور، ایک کالے رنگ کا جہاز سمندر میں تنہا کھڑا تھا اس پر سُرخ رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے۔ جب اس کی کشتی پاس سے گزری تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ معاً اُسے ڈر لگا کہ کہیں یہ بارود بھک سے اڑ نہ جائے ـــــ جب کشتی ذرا دُور نکل گئی تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی توند پر رکھ لیے۔

کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جا لگی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ملاح نے بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پیرس ہے آس پاس اور بھی چند جزیرے تھے، ان کے ساحلوں پر بھی اِکّا دُکّا کشتیاں کھڑی تھیں۔ کہیں وینس تھا، کہیں نیپلز ـــــ کہیں روم ـــــ

ملاح نے بادبان کھول کر کشتی پر ایک سائبان سا تن دیا۔ پھر اس نے سیٹھ

قائم علی دائم علی کو آنکھ ماری "لو سیٹھ، میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا ـــــ تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو ـــــــــــــــ"

عیدگاہ کے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے۔ یہاں ہر روز عید ہے ہر شب شب برات! ٹاٹ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ گوشت روٹی، سلے ہوئے کپڑے، پرانے بوٹ، تازے پھل، لوہے کی میخیں، لکڑی کے صندوق، چمڑے کی کرسیاں، تیل، اچار، صابن ـــــ بے گھر اور بے در مہاجر سہارے کی ہر ممکن لڑی تھام کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب قسم کا اطمینان، ایک عجیب قسم کی ابدیت اس ماحول پہ جاری و ساری ہے ـــــ جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کارواں آخر اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دو حصے کیے ہوتے ہیں۔ سامنے کی طرف دلشاد پکوڑیاں تل رہی ہے۔ پچھلی طرف زبیدہ دہی بڑے لگائے بیٹھی ہے۔

ایک لمبا تڑنگا پٹھان پکوڑیوں کے سامنے پھسکڑا مارے بیٹھا ہے۔

"گرم گرم پکوڑیاں ہیں، خان ـــــ کھا لو ـــــ بولو کتنے کی دوں؟"

"نرم ہے، خو، گرم ہے؟" پٹھان نے آنکھ ماری۔

"ہاں خان! نرم ہے، خو گرم ہے!" دلشاد کڑھی منہ کے سامنے کر کے مسکرائی

دلشاد کی مسکراہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر سورج یا چاند یا تارے بھی اُسے اٹھالے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اُسے چھین لائے گا۔

پٹھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "خو ایک روپیہ؟"

"نہیں خان، خو پانچ روپیہ ——————"

"ہٹ، خو، ڈھائی روپیہ؟"

"خو، پانچ۔"

پٹھان نے اپنی جیب کے پیسے گنے۔ اس کے پاس تین روپے چار آنے تھے اس نے پونے دو روپیہ کا ادھار کرنا چاہا لیکن دلشاد نے اُسے مجبور کر دیا کہ خان، قرض محبت کی قینچی ہے۔ تم پیسے پورے کرلاؤ۔ میں تمہیں جھٹ پٹ نرم نرم، گرم گرم پکوڑیاں اتار دوں گی۔

پٹھان مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے دہی بڑوں کا سودا کیا۔ زبیدہ ابھی بچہ تھی، نادان تھی، معصوم تھی اس لیے وہ پونے دو روپے کا ادھار

مان گئی۔

زبیدہ نے دلشاد کو آواز دی۔ "بہن ذرا اس طرف دھیان رکھنا محمود سو رہا ہے۔ میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دہی لے آؤں۔

اسی طرح جب دلشاد بھی اپنی پکوڑیوں کے لیے بین لینے کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو زبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ دہی اور بین کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔ جب دلشاد کی بچی نرم نرم، گرم گرم پکوڑیوں پر پل کر جوان ہوگی۔ جب زبیدہ کا محمود دہی بڑوں کی چاٹ پر سیانا ہوگا، تو اسلام کی برادری میں دو گرانقدر رکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی، ایک خوبصورت بہن ——— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ اینٹ اور گارا ہے جس سے بہادر قومیں تعمیر ہوتی ہیں ——— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ نعمتِ عظمیٰ ہے، جو نعمتوں والے عظمتوں والے باری تعالیٰ نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔ دہی مشرق کا

مالک ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے درختوں پر خرمے اور انار لگائے۔ وہی دریاؤں سے موتی اور مونگے نکالتا ہے۔ وہی جنت کا رحمان ہے، وہی دوزخ کا قہار ہے ——— پھر تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

ابنِ انشا

کے دلچسپ سفرنامے

☐ شگفتہ، شگفتہ ☐ رواں دواں

کارٹونوں سے مزین آفسٹ طباعت، کپڑے کی جلد، خوبصورت گردپوش

آوارہ گرد کی ڈائری

احوال یورپ اور مشرق وسطیٰ کے سفر کا لندن پیرس جرمنی ہالینڈ سوئٹزرلینڈ، دیانا، مصر، شام و لبنان وغیرہ

۱۲ روپے

دنیا گول ہے

ایک سفر دنیا کے گرد، کولمبو، انڈونیشا، سنگاپور، کوالالمپور، بنکاک، ہانگ کانگ، منیلا، جاپان، کوریا، ہوائی، امریکہ، لندن، پیرس، انقرہ، تہران اور کابل۔

۱۲½ روپے

چلتے ہو تو چین کو چلئے

چین میں پچیس دن، ایک سفرنامہ جس نے چین کے "لادینوں اور انکے پرانوں کے کارناموں کی۔

۶ روپے

اور لطیف طنز و مزاح کا شاہکار

اردو کی آخری کتاب

جدید اردو ریڈر نا منظور کردہ ٹیکسٹ بک بورڈ "ابن انشا کا اسلوب آہنگ نیا ہی نہیں، ناقابل تقلید بھی ہے" (مشتاق احمد یوسفی)

۱۰ روپے

ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں

تازہ ترین سفرنامہ ایران، لنکا، لندن، پیرس، جرمنی، فلپائن، ہانگ کانگ اور جاپان کا

۱۵ روپے

لاہور اکیڈمی ۔ لاہور